© rasailojaraid.com

(ملاحظہ ہو منڈک اُپ نشد ۱:۱) اس لیے اتھرو وید انھیں کی طرف منسوب ہے ان کا چھوٹا لڑکا انگرس تھا (ملاحظہ ہو گوپتھ برہمن) چنانچہ از روئے تاریخ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ بڑے حضرت اسماعیلؑ اور چھوٹے حضرت اسحٰقؑ۔ انھوں نے یہ تمنا کی کہ "اے پروردگار عالم میں تیرا فرماں بردار ہونے پر بھی تنہا اور بے اولاد ہوں۔ کیا اچھا ہو کہ میں اپنی مثل اپنی صفات کا دوسرا دیو (روشن پیغمبر) پیدا کروں اس نے سخت محنت شاقہ سے ریاضت کی" (گوپتھ برہمن ۱:۱، بائبل پیدائش ۱۵: ۱تا۴) گوپتھ برہمن میں اس کے بعد افسانہ کے رنگ میں لکھا ہے کہ ان کے یہاں میٹھے اور کھاری دو الگ الگ پانیوں سے اتھروا اور انگرس پیدا ہوئے۔ میٹھے پانی سے اتھروا اور کھاری پانی سے انگرس کی پیدائش ہوئی۔ میٹھے پانی سے مراد اتھروا کی ماں پاربتی (ہاجرہ) جو حلیم مزاج اور صابر تھیں۔ کھاری پانی سے مراد انگرس کی ماں سرسوتی (سارہ) جو نہایت تنک مزاج اور غصیلی تھیں۔

اس افسانہ میں بھی ایک حقیقت ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں بیٹوں کی نسل یعنی بنو اسماعیل اور بنو اسرائیل میٹھے اور کھاری سمندر کی مثال ہیں۔ بائبل میں کئی جگہ کھاری اور میٹھے سمندر کی تمثیل آتی ہے۔ کھاری سمندر بنی اسرائیل ہیں جنکو قربانیوں، بچہ کی پیدائش وغیرہ کی رسوم میں نہایت سختی سے نمک کے استعمال کا ذکر ہے (احبار ۲: ۱۳، حزقیل ۱۶: ۴) جناب مسیحؑ فرماتے ہیں۔ "اے بنو اسرائیل تم زمین کے نمک ہو" (متی ۵: ۱۳) کتاب شمار ۱۸: ۱۹ میں لکھا ہے "یہ نمک کا عہد خدا کے حضور ہمیشہ کے لیے ہے"۔ بائبل کے ان بیانات سے آپ کو کھاری و نمکین سمندر کا پتہ چل گیا۔ اب آیئے شیریں اور میٹھے سمندر پر نظر ڈالیں جو حضرت ہاجرہ اور ان کی اولاد سے متعلق ہے۔ ارشاد باری ہے۔ "وھو الذی مرج البحرین ھٰذا عذبٌ فراتٌ وھٰذا ملحٌ اُجاجٌ وجعل بینھما برزخاً و حجراً"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محجوراً (۲۵:۵۳) اور اللہ وہی ہے جس نے دو سمندر چلا رکھے ہیں یہ میٹھا ہے اور بہت میٹھا اور وہ کھاری ہے سینہ جلانے والا۔ ان دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے اور روکنے والی روک ہے۔ گویا بنو اسماعیل اور بنو اسرائیل دو میٹھے اور کھاری سمندر ہیں۔ اَلْمُوْمِنُ حُلْوٌ مومن شیریں ہوتا ہے (حدیث) ان میٹھے اور کھاری سمندروں کے ملنے میں صدیوں سے ایک روک ہے۔ مگر اب مرج البحرین ملتقیان بینھما برزخ لا یبغیان (۵۵:۲۱) یہ بہتے ہوئے دونوں سمندر ملا دیئے جائیں گے ان دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے جس سے ایک دوسرے پر بغاوت نہیں کر سکتے۔ غور کیجیے یہ شرقی و غربی آرین اور سامی یا اسرائیلی و اسماعیلی دو سہارے اور میٹھے سمندر ہیں جو اقوام عالم کے باپ برہما جی یا حضرت ابراہیمؑ سے پیدا ہوئے ہیں ابراہیم کی اولادیں سے اس پیشینگوئی کا مبشر نبی اس برزخ (دادٹ) کو کاٹ کر دونوں سمندروں کو ملا دے گا جناب ابراہیمؑ کی نسل کے کل انبیاء کی تصدیق کرے گا اور کل امۃ واحدۃ کا سبق پڑھائے گا۔ جبکہ بنی اسرائیل نے صرف اپنے انبیاء کی تصدیق کی۔ آریوں نے صرف اپنے رشیوں کو تسلیم کیا۔ لیکن پیشینگوئی کا وہ موعود برہما اور دعاء ابراہیم آتا ہے جو ابراہیم کے گھرانے کی تمام بکھری ہوئی قوموں کو یکجا جمع کرے گا۔ مسیح اس لیے آئے کہ صرف بنو اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع کریں۔ لیکن وہ موعود نبی (محمدؐ) اس لیے مبعوث ہوئے کہ تمام دنیا کی گم شدہ قوموں کو یکجا اکٹھا کریں۔ اتنا سمجھ لینے کے بعد اب ذرا اس پیشینگوئی پر نظر ڈالیے جو پیدائش باب ۱۲ آیۃ ۲ میں محفوظ ہے۔

(باقی آئندہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفسیری رجحانات اور نئی تفسیر کی ضرورت

ڈاکٹر معین الدین اعظمی

روئے زمین پر قرآن کے علاوہ کوئی ایسی دینی کتاب نہیں ہے جس نے دیباچہ کے بعد اپنا آغاز اس چیز سے کیا ہو کہ اس کی صداقت پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا الم ذلک الکتاب لا ریب فیہ اور اگر کوئی آدمی اور خاص کر تعلیم یافتہ خواہ وہ کسی مذہب کا پیرو ہو اگر اس جملہ سے قرآن کی ابتدا پر سنجیدگی سے غور کرے تو وہیں اس کو اس کتاب کی عظمت کا اندازہ ہونے لگے گا اور معلوم ہو گا کہ اس کتاب کا ایک ایک جملہ اور لفظ کسی خاص حکمت کے پیشِ نظر رکھا گیا ہے جو خاص وقت اور مطالعہ چاہتا ہے۔

واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے شروع ہی سے اس کتابِ مقدس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اور ہر پہلو سے اس کی تعلیمات کو جاننے اور اس کو مشعلِ راہ بنانے کے لیے شاندار کوشش کی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی تفسیر کا جو مفہوم بالکل آغاز میں تھا وہ باقی نہ رہ سکا یعنی شروع میں تفسیر کا فن مستقل فن نہ تھا لیکن یہ علم حدیث کا ایک جزو تھا اور جب کسی آیت کی تفسیر اور اس کا مطلب سمجھنا ہوتا تھا تو رسول اللہ اور اس کے اصحاب سے اس سلسلہ میں جو مروی ہوتا تھا اس کو پیش کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ تفسیر کو تفسیر بالرائے یعنی من مانی یا خیالی تصور کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے اس مفہوم و تصور کے لحاظ سے قرآن کی تفسیر کا ذخیرہ بہت ہی معمولی تھا اور اس دائمی چشمہ سے پورے طور پر فیض یاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہو ا جا سکتا تھا۔ لہٰذا علماء کی ایک جماعت نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ عقل اور اجتہاد کو بھی قرآن کی تفسیر میں دخل ہونا چاہیے۔ مگر عقل کا یہ استعمال قرآن میں ایک جائز حدود اور دائرہ میں ہونا چاہیے۔ یعنی قرآن کی تفسیر جو بھی ہو اگر وہ عربی اصول اور قواعد کے لحاظ سے درست ہے تو وہ تفسیر بالرائے نہ ہوگی۔

تفسیر میں یہ طریقہ ماثور یعنی ایک آیت کی تفسیر کلام رسول اور اقوال صحابہ سے کرنا سب سے پہلے رائج ہوا۔ اس اصول و نہج پر جو مشہور تفسیریں لکھی گئیں وہ یہ ہیں:۔ تفسیر ابن عباس، تفسیر ابن جریر الطبری، تفسیر ابن کثیر، سیوطی کی تفسیر الدر المنثور، تفسیر ماثور کے ساتھ ہی ساتھ دوسری تفسیریں بھی وجود میں آنے لگیں۔ جن میں ماثور کم اور دوسری عقلی اجتہادی اور خصوصی باتیں زیادہ ہونے لگیں۔ اعتقادی تفسیر جیسے زمخشری کی مشہور کتاب 'کشاف' صوفی رجحانات کے مطابق تفسیر جیسے ابن العربی کی تفسیر، اسی طرح شیعی تفسیر اور عقلی وکلامی تفسیر جیسے امام رازی کی تفسیر مفاتیح الغیب۔ ان مشہور و عام رجحانات کے علاوہ اور بھی مختلف نقطہائے نظر سے تفاسیر وجود میں آنے لگیں۔ جیسے نحوی، ادبی، فقہی، تاریخی اور سائنسی لحاظ سے۔

غرض قرآن جو انسانی ہدایت کے لیے نازل ہوا تھا ہر گوشہ سے مفسرین نے اس سے روشنی حاصل کرنی چاہی اور اس چیز میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ اصلی مقصد اس لحاظ سے ثانوی ہو گیا کہ دوسری بحثیں بہت زیادہ شروع ہو گئیں اور باوجود اس کے کہ اصول تفسیر کے کچھ شرائط مقرر کر دیے گئے تھے ان کی پابندی نہ ہو سکی۔

میرا مقصد یہاں تاریخ تفسیر بیان کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اہم تفاسیر،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اہم تفسیری رجحانات" کا ایک جائزہ لینا ہے۔ ورنہ میں اس کو تفصیل سے بیان کرتا۔

یہاں پر ایک عجیب بات ہے اور وہ یہ کہ تفسیر میں ہر ایک مفسر نے اپنے پہلے مشہور مفسر سے اس قدر چیزیں نقل کی ہیں کہ ایک تفسیر کے طالب علم کو حیرت ہوتی ہے اور خاص کر تفسیر کی وہ کتابیں جو تفسیر ماثور کے نام سے موسوم ہیں، لہذا جب کوئی تفسیر ابن جریر الطبری، تفسیر ابن کثیر اور تفسیر الدر المنثور میں باہم موازنہ کرے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی اور ان تفاسیر میں مرجوح روایات کا اس قدر وافر حصہ ہے کہ بسا اوقات وہ قرآن کے ربط اور نظم معنوی کو منقطع اور درہم برہم کر دیتا ہے، نیز ان تفسیروں میں اس قدر سطحیت نظر آتی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کے ظاہری معنیٰ کے علاوہ اس کے اندر کیا فلسفہ اور کیا حکمت ہے اس تک رسائی نہ ہو سکی۔

دوسرے مکتب خیال کی تفسیر جس کو اعتقادی یا اپنے خیالات وافکار کے مطابق قرآن کی تفسیر کہا جائے ان میں تفسیر کشاف ہے۔ اس تفسیر نے سب سے پہلے قرآن کے اندر جو ادبی لطافت اور معنوی نظم ہے اس کو اس طرح اجاگر کرنے کی کوشش کی کہ قاری مطمئن ومتاثر ہو جائے اس میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی۔ اس کے علاوہ اس نے عقلی تحلیل پر خاص زور دیا جو تفسیر ماثور میں نہیں پائی جاتی۔

مگر عجیب لطف ہے کہ مفسرین اس کو معتزلی قرار دیتے ہیں اور اس کو مستحسن تفاسیر میں شامل نہیں کرتے لیکن اس سے مفسرین نے اس قدر فائدہ اٹھایا ہے اور متاثر ہوئے ہیں کہ میرے خیال میں اگر تفسیر طبری سے زیادہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں۔ تو تفسیر ابن کثیر اور الدرالمنثور سے کہیں زیادہ اٹھایا اس تفسیر کے اندر گو اعتزال تھا۔ مگر جو اچھائیاں تھیں اگر دوسرے مفسرین ان اچھائیوں کا ادراک کرتے تو قرآن کی تفسیر صحیح سمت میں دور تک پہنچ سکتی تھی۔

تیسری تفسیر جس پر مفسرین نے عام طور پر تنقید کی ہے اور بعض لوگوں نے یہاں تک کہدیا کہ تفسیر کے علاوہ اس میں ہر چیز ہے وہ تفسیر مفاتیح الغیب ہے جو تفسیر رازی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بیان ایک متطرفانہ بیان تھا کیوں کہ مفسرین اس تفسیر سے تفسیر کشاف سے بھی زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اس تفسیر کا خاص امتیاز یہ ہے کہ عقلی طور پر امام رازی ہر قسم کے مسائل اور علوم کا استخراج کرتے ہیں اور ہر مسئلہ میں نقلی و عقلی دونوں تاویلیں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ ہم نے عام طور پر یہ دیکھا ہے کہ مفسرین انھیں اقوال میں سے اپنے پسند کے لحاظ سے کوئی تاویل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس تفسیر کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ نظم معنوی کو اجاگر کرنے کی قابلِ ستائش کوشش کی گئی ہے اور کہیں کہیں بہت ہی واضح قسم کا ربط معنوی موجود ہے۔

ان کے علاوہ جتنی بھی تفسیریں ہیں اگر وہ تفسیر ماثور میں سے ہیں تو طبری ابن کثیر اور الدرالمنثور سے متاثر ہیں اور اگر عقلی ہیں تو کشاف اور رازی سے سخت متاثر ہیں اور جدت ابتکار اور اصلیت اور نئے منہج و اسلوب کا ان میں فقدان ہے اس طریقہ علوم قرآن پر جو کتابیں ہیں ان کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی لوگوں کو تفسیر پر کام کرنے کا شوق بہت ہوا اگر اس میں محققانہ بات کہنے کی ہمت کم ہوئی۔ مثال کے طور پر آپ امام زرکشی کی کتاب البرہان فی علوم القرآن اور امام سیوطی کی کتاب الاتقان فی علوم القرآن کا موازنہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ امام سیوطی صاحب نے صفحے کے صفحے زرکشی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی کتاب البرہان فی علوم القرآن سے بغیر حوالہ کے نقل کئے ہیں۔

ان تمام تفاسیر اور علوم قرآن کی کتابوں میں دو باتیں مشترک ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان میں ہر مسئلہ پر مختلف رایوں کو جمع کردیا گیا ہے اور قطعی اور محققانہ رائے کم ملتی ہے۔

اب ہم ان تفسیروں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد، دو تین صدی کے اندر ہندستان و مصر میں تفسیر پر جو کام ہوا ہے اس کا سطحی جائزہ لیتے ہیں۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے بعد سے تفسیر پر بہت قابلِ قدر کام ہوا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے وسعت مطالعہ اور اجتہادی رائے کے ذریعہ بہت سے مسائل پر محققانہ بحث کی۔ آپ نے علوم قرآن کے مسائل جیسے اسباب نزول، ناسخ و منسوخ، متشابہات اور دوسرے مسائل پر سیر حاصل بحث کی۔ قرآن کا ترجمہ کیا جو تفسیر کے مانند ہے۔ اس کے بعد تفسیر کا کام بہت تیزی سے آگے بڑھا اور تفسیر میں مولانا فراہی، مولانا تھانوی اور مولانا آزاد کی بہتر تفسیریں ملیں۔ ان تفسیروں میں نظم معنوی کا کافی خیال کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی التزام کیا گیا کہ مختلف تاویلات میں سے جو تاویل صحیح ہو صرف اس کو نقل کیا جائے اور بقیہ کو چھوڑ دیا جائے۔

ہندوستان کے مفسرین میں سے فراہی صاحب کے یہاں اجتہاد اور جدت سب سے زیادہ ہے۔ آپ نے قرآن کی ایک قطعی تاویل پر زور دیا۔ فراہی صاحب نے گو پوری تفسیر نہ کی کیوں کہ عام اور سطحی تفسیر کو وہ پسند نہ کرتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ محققانہ بات کرنے پر زور دیتے تھے۔ انہوں نے قرآن میں نظم معنوی کے وجود اور اس کو تلاش کرنے کے مختلف نقلی اور عقلی اصول بتائے۔ اور ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ نظم قرآن پر گو پہلے ابوبکر النیشاپوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے زمانہ سے موجود تھی اور زمخشری و رازی کے علاوہ دوسرے مفسرین نے بھی اس کی طرف توجہ کی۔ مگر امام فراہی نے نظمِ قرآن کو جاننے کے لیے سب سے پہلے اصول و قواعد بنائے اور اس کو باقاعدہ ایک فن بنا دیا اور اس طرح تمام متقدمین و متاخرین و معاصرین پر سبقت لے گئے۔ اس طرح اگر فراہی کے اصول تفسیر کے مطابق تفسیر کی جائے تو سب سے پہلے آیت کی صحیح تاویل سامنے آئے گی پھر قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں باہم گہرا تعلق سامنے آئیگا۔

۱ عرب دنیا میں مصر میں تفسیر پر دو تین صدی میں بہت اچھا کام ہوا ہے جو مختلف اعتبارات سے ہندوستان سے کہیں زیادہ بہتر اور عمدہ ہے ان میں شیخ عبدہٗ نے جو تفسیر کی، اور جو اصول اور مناہج بنائے وہ پرانی تفسیر کے مقابلہ میں بہت عمدہ ہیں۔ اس تفسیر کا خاص امتیاز یہ ہے کہ قرآن انسانی ہدایت کے لیے نازل ہوا، لہذا سب سے پہلے مفسر کو قرآن میں یہ چیز حاصل کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی اس تفسیر میں قرآن کی ادبی فنی اور نظم معنوی کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن بہت التزام کے ساتھ نہیں۔ یعنی ثانوی حیثیت کے ساتھ۔ شیخ رشید رضا کی تفسیر چونکہ شیخ عبدہٗ کی تفسیر کا اکمال ہے۔ اس لیئے اس پر کلام و بحث کرنے کا خاص فائدہ نہیں۔

۲ مصر کی دوسری تفسیروں میں سید قطب کی مشہور تفسیر فی ظلال القرآن ہے۔ یہ مکمل تفسیر ہے اور اسلوب و بیان کے لحاظ سے تمام تفسیروں میں عمدہ ہے۔ ان تفسیروں میں قرآن کی فنی خوبیوں کو اس قدر پیارے انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ جس کی نظیر نہیں۔ البتہ معنوی نظم و ربط اس قدر معقول و مضبوط نہیں ہوتا۔ یہ تفسیر بہت عمدہ ہے، اگر مؤلف نے نظم معنوی کے ادراک کے لیے کوئی اصول بیان نہیں کیا۔ جس سے دوسروں کو کچھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آسانی ہو، اس تفسیر میں ایک کمزوری مجھ کو یہ نظر آئی کہ تفسیر و تاویل میں محققانہ انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے اور بہت جگہوں پر کمزور، نقلی تاویلات واقوال پر اعتماد کیا گیا ہے اور اجتہادی و محققانہ چیز کم ہے۔

۳۔ مصر میں تیسری تفسیر جو چند سورتوں کی تفسیر ہے مگر باقاعدہ ایک اصول اور منہج رکھتی ہے، اس منہج کے ذریعہ پورے قرآن کی تفسیر کی جاسکتی ہے وہ ہے ڈاکٹر بنت الشاطی کی التفسیر البیانی للقرآن، یہ بالکل ایک نئے منہج اور اصول پر لکھی گئی ہے جو تفسیر کے مقدمہ اور امین الخولی صاحب کی کتاب مناہج تجدید فی النحو والبلاغت والتفسیر والادب میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس منہج کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن کی موضوع کے لحاظ سے تفسیر کرنے پر زور دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن کو موضوع کے لحاظ سے مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکاۃ قصص احکام اور تبلیغ کو مختلف جگہوں پر بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا جب کسی چیز کی تفسیر مطلوب ہو تو پورے قرآن میں اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیے اور تاریخ نزول کے اعتبار سے اس کا پورا علم حاصل کرنا چاہیے اور پھر اس کی تفسیر کرنی چاہیے۔

اس تفسیر کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ ہر آیت پر از سر نو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے اور کسی بھی مفسر کے قول کو بغیر تنقید و تمحیص کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس تفسیر میں تمام نقلی وعقلی اور دوسری تاویلات میں سے کسی ایک تاویل کو لے کر دوسری تاویلات کے بطلان اور کمزوری کو اجاگر کیا جاتا ہے اور اسرائیلیات کا جو تسلط ہو گیا تھا اس کو باطل کیا جاتا ہے اس طرح یہ بہترین تفسیر ہے۔

سوریا میں ڈاکٹر محمد المبارک نے بھی اپنی کتاب المنهل الخالد میں قرآن کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفسیر کا ایک طریقہ پیش کیا ہے۔ یہ طریقہ محمد قطب اور بنت الشاطی کے طریقے سے ملتا جلتا اور متشابہ ہے۔ اس میں انھوں نے قرآن کے نظم معنوی اور ادبی خوبصورتی کی طرف خاص اہتمام کیا ہے۔ مگر انہوں نے نظم معنوی تلاش کرنے کے لیے کوئی اصول نہ بتائے بلکہ اس کو لوگوں کے ذوق و ذہانت اور وجدان پر چھوڑ دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے صرف چند سورتوں کا نمونہ پیش کیا۔ کاش وہ پورے قرآن کی تفسیر اس انداز سے کر دیتے تو اسرائیلیات اور قیاسی باتوں کا جو ایک بہت بڑا ذخیرہ قرآن کی تفسیر میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ دور ہو جاتا اور قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کا راستہ ایک خاص منزل تک پہنچ جاتا۔

ہندوستان کے علامہ فراہی اور مصر کی ذاکر بنت الشاطی کی تفسیر میں مجھ کو بہت پسند آئیں، کیونکہ ان دونوں تفسیروں میں کئی چیزیں بیّن طور پر مشترک ہیں۔ مثال کے طور پر۔

۱۔ قرآن کی قطعی تفسیر یعنی اسباب کی تحدید کہ قرآن کی کیا مراد ہے۔

۲۔ بلاغت قرآن کا ظہور۔

۳۔ اسرائیلیات جو قرآنی کی تفسیر میں بڑی حد تک سرایت کر گئی ہیں ان کا اخراج۔

۴۔ اخلاق احکام کے حلت و حرمت کا فلسفہ اور ان کے دور رس فوائد و نتائج کا انکشاف۔

۵۔ اسباب نزول، ناسخ و منسوخ، متشابہات، قسم قرآنی، اور مقطعات کے مسائل کا حل اور ان پیچیدہ مسائل کی اقرب ترین تاویل۔

نئی تفسیر کی ضرورت اور طریقہ تفسیر۔

© rasailojaraid.com